مولوی صاحب

(بچپن کے ایک مشفق اور محسن استاذ و مربی کا تذکرہ)

پروفیسر سید ابوالخیر کشفی

ہمارے مولوی صاحب، ہمارے خاندان کا حصہ تھے، والد کے دوست، گھر والوں کے متیر اور ہم بھائی بہنوں کے اتالیق۔ وہ ہماری زندگی کا ایسا حصہ تھے کہ ان کا ذکر کئے بغیر ہمارے بچپن اور لڑکپن کی یاد مکمل نہیں ہوتیں۔ وہ ہماری زندگی کا حصہ کیسے بنے؟ یہ بھی دلچسپ واقعہ ہے۔

ہماری مسجد کے قریب نکھٹو شاہ کی مسجد تھی۔ عموجان (والد مرحوم) کبھی کبھی اس مسجد میں بھی نماز پڑھنے چلے جاتے۔ ایک دن وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی مرغی کو ذبح کر کے اس کے پر الگ الگ نوچ رہا ہے، والد صاحب کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، اور اس نوجوان سے باتیں کرنے لگے، معلوم ہوا کہ وہ مشرقی یوپی کے کسی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کی تلاش میں کان پور آیا ہے، اور اسے کھانا پکانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے، والد صاحب نے اس سے عربی میں بات چیت کی اور پھر فارسی میں گفتگو کی۔ دونوں زبانوں میں اس کی روانی اور الفاظ کے انتخاب سے عموجان بہت متاثر ہوئے۔ آج سے ستر سال پہلے عربی مدرسوں میں فارسی کا خاصا چلن تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ فارسی ادبیات پر عربی مدرسوں کے طالب علموں کو عبور حاصل ہوتا۔ اس طرح ان طالب علموں کی عربی استعداد کتابی ہوتی تھی۔ عموجان نے ٹھوک بجا کر اس نوجوان فارغ التحصیل سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے ساتھ رہنا پسند کرے گا؟ ملازمت کی شکل یہ نکالی گئی کہ وہ ان کے بچوں کو تعلیم دے۔

یہ تھے ہمارے مولوی صاحب۔ محمد سعید خاں رزمی۔ وہ مسجد سے ہمارے مردانے میں منتقل ہو گئے۔ مردانہ مکان کے سامنے خالی زمین پر ان کے لئے ایک کمرے کی تعمیر شروع ہوئی۔ دس بارہ دن میں کمرہ مکمل ہوا اور مولوی صاحب اس میں منتقل ہو گئے۔ کمرے کی تاریخ بدلتی رہی مگر وہ آج بھی ''مولوی صاحب کا کمرہ'' کہلاتا ہے۔

جب مولوی صاحب ہمارے ہاں آئے تو میری عمر کوئی چھ سات سال کی تھی۔ اور میری بہن حمیرا مجھ سے کوئی ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔ باجی خود مجھے قرآن شریف پڑھاتی تھیں اور اسی کے ساتھ ساتھ مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو کتابیں۔ مولوی صاحب نے مجھ سے قرآن شریف سنا اور مطمئن ہو گئے کہ باجی ٹھیک پڑھا رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے طے کیا کہ وہ مجھے فارسی پڑھائیں گے اور یوں گلستانِ سعدی کی کیاریاں میرے لئے ایک نئی دنیا بن گئیں۔ کیسے دن

تھے وہ بھی جب فارسی کی تعلیم میں ''آمدن نامے'' کے بعد ''گلستان'' آجاتی اور فارسی زبان کے ساتھ اخلاقیات کی منزلیں تدریجاً طے ہوتی جاتیں، آج تعلیم کے سلسلے میں نظریات کی بھرمار ہے اور ان نظریات میں علم کہیں گم ہوگیا ہے۔

دو تین ہی سال میں فارسی سے میرا رشتہ اتنا مضبوط ہوگیا کہ میں ربیع الاول کے جلسوں میں سیرت پر فارسی میں تقریریں کرنے لگا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ عموجان نے مجھے یہ تقریریں رٹادی ہیں، اور وہ جب مجھے میرے حافظے کی داد دینے آتے تو ان کا واسطہ عموجان کی بجائے مولوی صاحب سے پڑتا۔ مولوی صاحب عالم بھی تھے اور پٹھان بھی۔ ظاہر ہے کہ غصہ تیز تھا، وہ بگڑ کر ایسے لوگوں سے کہتے کہ ابوالخیر کو ان کی عمر کے مطابق کوئی موضوع دے دیجئے، وہ اس پر آپ کے سامنے گفتگو کریں گے۔

ہم دونوں کی تعلیم کا بوجھ کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ مولوی صاحب میرے رشتے کے بھائیوں کو بھی پڑھانے لگے۔ شاید ترسیل عالم کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں کو پڑھانا ان کے غصے کے نکاس کی ایک صورت تھی۔ مولوی صاحب بڑی بے رحمی سے ان بچوں کو مرغا بناتے کبھی کبھی ان مرغوں کی پیٹھ پر کوئی چیز رکھتے کہ اگر یہ گری تو تمہاری پٹائی ہوگی۔ میں اکثر ان کی مار سے بچا رہتا۔ لیکن ایک دن انہوں نے چھڑی سے میرے ہاتھ پر ایسی ضرب لگائی کہ ہتھیلی پھٹ گئی اور خون بے تحاشا بہنے لگا، مولوی صاحب بے حد پریشان ہوئے۔ عموجان کو مجھ سے بے حد محبت تھی، اور مولوی صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے معاش اور رہائش کا سلسلہ منقطع نہ ہوجائے۔ ان کو مجھ سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ میں روتا ہوا زنان خانے میں والدہ کے پاس گیا۔ باجی بھی رونے لگیں۔ انہوں نے ریشم جلایا اور میرا زخم بھر دیا۔ پھر پٹی باندھی اور مجھ سے کہا کہ تم کسی بڑے کے ساتھ لکھنو چلے جاؤ تاکہ تمہارے عموجان کو خبر نہ ہو۔ اگر انہوں نے مولوی صاحب کو نکال دیا تو تمہیں زندگی بھر علم نہیں آئے گا۔ یہ وہ دور تھا جب استاد کی قدر و منزلت کتنے ہی رشتوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ اس واقعے کے بعد مولوی صاحب میں خاصی نرمی پیدا ہوگئی۔ اب وہ اپنے طالب علموں کو ڈانٹنے اور زیادہ سے زیادہ گوش مالی پر اکتفا کرتے۔

مولوی صاحب بیماری سے بہت گھبراتے تھے۔ ہم لوگوں نے ان کی اس کمزوری سے خوب ہی خوب فائدہ اٹھانا شروع کیا، ہم میں سے کوئی مولوی صاحب کے جسم پر ہاتھ رکھتا اور گھبرا کر کہتا کہ آپ کو تو بہت تیز بخار ہے، مولوی صاحب اپنے جسم کو ٹٹولتے اور کہتے نہیں تو۔ جواباً کہا جاتا کہ مریض کو خود احساس نہیں ہوتا۔ اتنے میں کوئی اور گرہ لگاتا کہ آپ کی تو آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی مولوی صاحب کمبل یا چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے اور بڑی نقاہت بھری آواز میں کہتے کہ جا کر چائے بنوالاؤ، خوب تیز چائے، بغیر دودھ کی۔ یوں ہم لوگ مولوی صاحب کو چائے پلا کر اور کمبل اوڑھا کر اپنی اپنی راہ لیتے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آکر مزاج پرسی کر لیتے۔

مولوی صاحب کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ اکثر رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ کبھی متنبی، کبھی فردوسی، اسی

زمانے میں انہوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ حلیم مسلم کالج کے ایک استاد انہیں انگریزی پڑھاتے اور ان سے عربی پڑھتے۔ کیسا زمانہ تھا وہ کہ علم کی معاشیات بھی پرانے زمانوں کی یاد دلاتی ہے، جب علم بھی تبادلے کی شکل میں منتقل ہوتا تھا، چیز کے بدلے چیز۔ علم کے بدلے علم، پیسے کا قدم درمیان میں نہ آتا۔

مولوی صاحب کو زور زور سے پڑھنے کی عادت تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب ریڈیو پر عربی، فارسی اور انگریزی کے پروگرام سنتے تھے۔ اس زمانے میں تعلیم میں سمع بصری ذرائع کی اہمیت کو شاید ہی کوئی جانتا ہو، مولوی صاحب نے ریڈیو پر اپنی زبان دانی کو صیقل کرنے کے لئے خوب استعمال کیا۔ اس لئے ان کے لہجے اور اندازِ کلام میں اس زبان کے تمام آداب ملحوظ ہوتے۔

انگریزی پڑھنے کے زمانے میں وہ اکثر جو بات کہتے، اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیتے تھے۔ اور ان کی گفتگو اور تدریس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ: ''اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ Bend before Adam فرشتوں نے انکار کیا They denied اللہ میاں نے کہا Get out نکل جاؤ۔

چند دن یہ کیفیت رہی۔ پھر تو مولوی صاحب انگریزی پڑھنے بھی لگے اور خاصی روانی سے بولنے بھی لگے۔ علم کی مسلسل جستجو انہیں بے قرار رکھتی اور وہ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھتے۔

دن میں مولوی صاحب ہم لوگوں کو پڑھاتے اور شام کو وہ عمو جان کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ یوں ان کا تعارف شہر کے اہلِ علم اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے ہو گیا۔ ان محفلوں میں ان کی شرکت محض بیت برائے بیت نہیں تھی۔ بلکہ بیشتر شرکاء سے زیادہ وقیع اور اہم تھی۔ مولوی صاحب میں بات کو گھما پھرا کر کہنے کی صلاحیت نہ تھی، وہ جو بات بھی کہتے وہ راست ہوتی، جب شاعر اپنا کلام سناتے تو بعض شعروں پر مولوی صاحب خاموش رہتے، داد نہ دیتے اور بعد میں شاعر سے کہتے کہ اس شعر میں یہ غلطی یا خامی تھی۔ سچ بولنے سے انہیں کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ عمو جان سے بھی انہیں اختلاف ہوتا تو اس کا بے دھڑک اظہار کرتے۔

اس فضاء میں مولوی محمد سعید خان بتوی رزمی ہو گئے۔ ان کی فطرت میں جو شاعر سو رہا تھا وہ بے داد ہو گیا۔ مولوی صاحب عمو جان سے اپنے شعروں پر اصلاح لینے لگے۔ مگر ادبی اور علمی گفتگو میں وہ اپنے استاد سے بھی اختلاف کا موقع ہوتا تو اختلاف کرتے۔ عمو جان نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب کی صلاحیتوں کو وسیع تر میدان ملنا چاہیے، اور عمو جان کی کوشش سے مولوی صاحب مولانا محمد علی میموریل اسکول میں پڑھانے لگے۔ استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت شہر میں پھیلنے لگی۔ ادھر مولوی صاحب نے انگریزی میں میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کر لئے، جو لوگ درس نظامی کے فارغ التحصیل ہوتے تھے، یہ رعایت ان کے لئے مخصوص تھی کہ وہ صرف انگریزی ہی میں ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات دے سکتے تھے۔ ان امتحانات کے پاس کرنے کے بعد مولوی صاحب حلیم مسلم انٹر کالج میں فارسی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔

کالج میں جدید تعلیم یافتہ اساتذہ کے درمیان انہیں اپنی علمیت کی وجہ سے امتیاز حاصل ہوا۔ اردو انگریزی کے لیکچرر اور پروفیسر بھی ان سے فیض حاصل کرتے۔

مولوی صاحب نے مجھے صرف فارسی ہی نہیں پڑھائی، بلکہ مشرقی اندازِ تنقید اور علم صنائع بدائع سے بھی روشناس کرایا۔ وہ اگر میری زندگی میں نہ آتے تو مجھے اپنی ادبی روایت سے آگہی حاصل نہ ہوتی۔ رومی، سعدی، حافظ وغیرہ کی تفہیم میں صرف زبان سے آگہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اپنے علوم کے ان سرچشموں سے بھی واقفیت لازم ہے جن سے یہ اکابر فیض یاب ہوئے تھے۔

سن ۴۸ء میں پاکستان چلا آیا اور مولوی صاحب نے بھی اپنے بال بچوں کو بستی سے بلوالیا اور چمن گنج (کان پور) میں رہنے لگے۔ لیکن ہر شام عموجان سے ملنے آتے اور عصر اور مغرب کی نمازیں ہماری مسجد میں ادا کرتے۔ میرے چھوٹے بھائیوں کو بھی وہ ہر شام پڑھاتے۔ جب میں ہر سال یا دوسرے سال پاکستان سے ہندوستان جاتا تو مولوی صاحب زیادہ وقت ہمارے ساتھ گذارتے۔ مولوی صاحب کان پور ہی کے ہو رہے۔ اور ۱۹۹۵ء تک زندہ رہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ ان کی شاعری محفوظ ہے یا نہیں اور اگر محفوظ ہے تو کس کے پاس ہے؟ مولوی صاحب کی علمیت کاغذ پر محفوظ نہیں۔ لیکن مجھ جیسے کتنے ہی شاگرد، ان کی علمیت کا معمولی اظہار ضرور ہیں۔ آج بھی ادب پر کچھ لکھنا ہوتا تو مولوی صاحب کا خیال آتا ہے کہ کوئی ایسی فاش غلطی نہ ہوجائے کہ اگر مولوی صاحب زندہ ہوتے تو مجھے ٹوکتے، جہاں وہ اچھی بات پر کھل کر داد دیتے تھے وہیں وہ کسی غلطی کو معاف کرنے کے قائل نہ تھے۔ اور زبان و بیان پر ان کی گرفت مثالی تھی۔

پچھلے دنوں میں، میں نے اپنے ماضی کے حوالے سے نعت اور نعت گوئی کی یادیں تازہ کی تھیں۔ اس مضمون میں میں نے مولوی صاحب کی علمیت، زبان دانی اور حبِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ذکر کیا تھا۔ وہ جب اقبال کا فارسی نعتیہ کلام پڑھتے اور اکثر فجر کے بعد تو فضا کے نور میں اور اضافہ ہوجاتا۔ ☆.....☆

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عام برتاؤ

✿..... سب سے ہنس مکھ ہو کر ملتے۔ ✿..... یتیموں کو پالتے، بیواؤں کی مدد کرتے۔ ✿..... غریبوں، مسکینوں سے پیار کرتے، ان میں جا کر بیٹھا کرتے۔ ✿..... سفید زمین پر بیٹھ جاتے، اپنے لئے کوئی سامان امتیاز پسند نہ فرماتے۔ ✿..... لونڈی، غلام بھی بیمار ہوجاتے تو خود ان کی خبر لیتے۔ ✿..... کوئی مسلمان مرجاتا اس پر قرض ہوتا تو بیت المال سے اس کا قرض دفن کرنے سے پہلے ادا کرتے۔ ✿..... کوئی مخلص مرتا تو اس کی تجہیز و تکفین میں شامل ہوتے۔ ✿..... منافق لوگ سامنے آکر گستاخیاں کیا کرتے۔ دشمنوں کو مدد دیا کرتے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ان سے بدلہ نہ لیا کرتے۔

(رحمۃ للعالمین، قاضی سید سلیمان منصور پوری: ۱/ ۲۷-۲۸)